مولانا زاہد الراشدی

غامدی صاحب کے ارشادات پر ایک نظر

جاوید احمد غامدی صاحب ہمارے محترم اور بزرگ دوست ہیں، صاحب علم ہیں، عربی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں، وسیع المطالعہ دانش ور ہیں اور قرآن فہمی میں حضرت مولانا حمید الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکتب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان دنوں قومی اخبارات میں غامدی صاحب اور ان کے شاگرد رشید جناب خورشید احمد ندیم کے بعض مضامین اور بیانات کے حوالے سے ان کے کچھ ''تفردات'' سامنے آ رہے ہیں جن سے مختلف حلقوں میں الجھن پیدا ہو رہی ہے اور بعض دوستوں نے اس سلسلے میں ہم سے اظہار رائے کے لیے رابطہ بھی کیا ہے۔ آج بھی ایک قومی اخبار کے لاہور ایڈیشن میں ''پشاور پریس کلب'' میں غامدی صاحب کے ایک خطاب کے حوالے سے ان کے بعض ارشادات سامنے آئے ہیں اور انھی کے بارے میں ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں مگر پہلے ان کے علمی و فکری پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ ان کی بات صحیح طور پر سمجھ میں آ سکتی ہے اور نہ ہی ہم اپنی بات وضاحت کے ساتھ کہہ پائیں گے۔ حضرت مولانا حمید الدین فراہی برصغیر پاک و ہند کے سرکردہ علمائے کرام میں سے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کے ماموں زاد تھے۔ ان کے اساتذہ میں مولانا شبلی کے علاوہ مولانا عبد الحئی فرنگی محلی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور پروفیسر آرنلڈ شامل ہیں۔ درسیات کی تکمیل کے بعد انھوں نے جدید تعلیم بھی حاصل کی اور بیک وقت عربی، اردو، فارسی، انگلش اور عبرانی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ حیدر آباد دکن کے دار العلوم کے پرنسپل رہے جسے بعد میں ''جامعہ عثمانیہ'' کے نام سے یونیورسٹی کی شکل دے دی گئی اور کہا جاتا ہے کہ دار العلوم کو ''جامعہ'' کی شکل دینے میں مولانا فراہی کی سوچ اور تحریک بھی کارفرما تھی۔

بعد میں حیدر آباد کو چھوڑ کر انھوں نے لکھنؤ کے قریب سرائے میر میں ''مدرسۃ الاصلاح'' کے نام سے درسگاہ کی بنیاد رکھی اور قرآن فہمی کا ایک نیا حلقہ قائم کیا جو اپنے مخصوص ذوق اور اسلوب کے حوالے سے انھی کے نام سے منسوب ہو گیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کے نزدیک قرآن فہمی میں عربی ادب، نزول قرآن

کے دور کے عربی لٹریچر اور روایات اور اس کے ساتھ عرف وتعامل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ حدیث
سنت کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں مگر ''خبر واحد'' کو ان کے ہاں وہ مقام حاصل نہیں ہے جو ''محدثین'' کے
تسلیم شدہ ہے اور وہ احکام میں ''خبر واحد'' کو حجت تسلیم نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے بعض علمی معاملات میں ان
اور ان کے تلامذہ کی رائے جمہور علما سے مختلف ہو جاتی ہے، مولانا فراہی کے بعد ان کے فکر اور فلسفہ کے
سے بڑے وارث اور نمائندہ حضرت مولانا امین احسن اصلاحی تھے جنھوں نے کچھ عرصہ قبل وفاقی عدالت
شادی شدہ مرد وعورت کے لیے زنا کی سزا کے طور پر ''رجم'' کے شرعی حد نہ ہونے پر دلائل فراہم کیے تھے اور
موقف اختیار کیا تھا کہ رجم اور سنگ سار کرنا شرعی حد نہیں ہے اس کے پیچھے بھی ''خبر واحد'' کے احکام میں
نہ ہونے کا تصور کارفرما تھا۔ یہ ایک مستقل علمی بحث ہے کہ احکام وقوانین کی بنیاد شہادت پر ہے یا خبر پر
اور شہادت کے نصاب ومعیار میں کیا فرق ہے؟ اس میں فقہا کے اصولی گروہ میں سے بعض ذمہ دار بزر
ایک مستقل موقف رکھتے ہیں جبکہ جمہور محدثین اور علمی فقہا کا موقف ان سے مختلف ہے اور ہمارے خیال
مولانا حمید الدین فراہی کا موقف جمہور فقہا اور محدثین کے بجائے ''بعض اصولی فقہا'' سے زیادہ قریب
اسی وجہ سے ہم اسے ان کے ''تفردات'' میں شمار کرتے ہیں اور ''تفردات'' کے بارے میں ہمارا موقف یہ
کہ ہر صاحب علم کا حق ہے، جس کا احترام کیا جانا چاہیے بشرطیکہ وہ ان کی ذات یا حلقے تک محدود رہے البتہ
کسی ''تفرد'' کو جمہور اہل علم کی رائے کے علی الرغم سوسائٹی پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ فکری انتشار
ایک نئے مکتب فکر کے قیام کا سبب بنتا ہے اور یہی وہ نکتہ اور مقام ہے جہاں ہمارے بہت سے قابل قدر
لائق احترام مفکرین نے ٹھوکر کھائی ہے اور امت کے ''اجتماعی علمی دھارے'' سے کٹ کر جداگانہ فکری حلقوں
کے قیام کا باعث بنے ہیں۔ بہر حال محترم جاوید احمد صاحب اور ان کے شاگرد رشید خورشید احمد ندیم صاحب
تعلق اسی علمی حلقے سے ہے اور مولانا امین احسن اصلاحی کے بعد اس حلقہ علم وفکر کی قیادت غامدی صاحب
رہے ہیں۔ پس منظر کی وضاحت کے طور پر ان تمہیدی گزارشات کے بعد ہم غامدی صاحب محترم کے
ارشادات کی طرف آ رہے ہیں جو انھوں نے گزشتہ روز ''پشاور پریس کلب'' میں گفتگو کرتے ہوئے فرمائے
ہیں اور جنھیں مذکورہ اخبار نے اس طرح رپورٹ کیا ہے کہ:

۱۔ علمائے کرام خود سیاسی فریق بننے کے بجائے حکمرانوں اور سیاست دانوں کی اصلاح کریں تو بہتر
مولوی کو سیاست دان بنانے کے بجائے سیاست دان کو مولوی بنانے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ زکوٰۃ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ٹیکسیشن کو ممنوع قرار دے کر حکمرانوں سے ظلم کا ہتھیار چھین لیا ہے۔

۳۔ جہاد تبھی جہاد ہوتا ہے جب مسلمانوں کی حکومت اس کا اعلان کرے۔ مختلف مذہبی گروہوں اور جتھوں کے جہاد کو جہاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔ فتووں کا بعض اوقات انتہائی غلط استعمال کیا جاتا ہے اس لیے فتویٰ بازی کو اسلام کی روشنی میں ریاستی قوانین کے تابع بنانا چاہیے اور مولویوں کے فتووں کے خلاف بنگلہ دیش میں فیصلہ صدی کا بہترین عدالتی فیصلہ ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ علماے کرام خود سیاسی فریق بننے کے بجائے حکمرانوں اور سیاست دانوں کی اصلاح کریں تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ موقع محل اور حالات کی مناسبت کی بات ہے اور دونوں طرف اہل علم اور اہل دین کا اسوہ موجود ہے امت میں اکابر اہل علم کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے جس نے حکمرانوں کے خلاف سیاسی فریق بننے کے بجائے ان کی اصلاح اور رہنمائی کا راستہ اختیار کیا ہے لیکن ایسے اہل علم بھی امت میں رہے ہیں، جنھوں نے اصلاح کے دوسرے طریقوں کو کامیاب نہ ہوتا دیکھ کر خود فریق بننے کا راستہ اختیار کیا ہے اور اس سلسلے میں سب سے بڑی مثال حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں جن کا شمار صغار صحابہ میں ہوتا ہے اور وہ بنیادی طور پر اہل علم میں سے تھے لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد انھوں نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور صرف انکار نہیں کیا بلکہ خود اس کے خلاف فریق بن گئے اور متوازی حکمران کے طور پر کئی برس تک حجاز اور دوسرے علاقوں پر حکومت کرتے رہے۔ اس لیے اگر کسی دور میں علماے کرام یہ سمجھیں کہ خود فریق بنے بغیر معاملات کی درستی کا امکان کم ہے تو اس کا راستہ بھی موجود ہے اور اس کی مطلقاً نفی کر دینا دین کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔

زکوٰۃ کے بارے میں غامدی صاحب کا ارشاد گرامی ہم سمجھ نہیں پائے اگر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے نظام کو مکمل طور پر اپنانے کی صورت میں اسلامی حکومت کو کسی اور ٹیکس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی تو یہ بات سو فی صد درست ہے اور ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ ایک نظریاتی اسلامی ریاست قرآن و سنت کی بنیاد پر زکوٰۃ و عشر کے نظام کو من و عن اپنا لے اور اس کو دیانت داری کے ساتھ چلایا جائے تو اسے لوگوں پر کوئی ٹیکس لگانے کی ضرورت نہیں رہے گی اور ملک بہت جلد ایک خوش حال رفاہی سلطنت کی شکل اختیار کر لے گا لیکن کیا کسی ضرورت کے موقع پر اور کوئی ٹیکس لگانے کی شرعاً ممانعت ہے؟ اس میں ہمیں اشکال ہے اگر غامدی

صاحب محترم اللہ تعالیٰ کی طرف سے زکوٰۃ کے بعد کسی اور ٹیکسیشن کی ممانعت پر کوئی دلیل پیش فرما دیں
مہربانی ہوگی اور اس باب میں ہماری معلومات میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدانخوا
ٹیکسیشن کے موجودہ نظام کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ نظام تو سراسر ظالمانہ ہے اور شریعت اسلامیہ کسی پر
بھی اس کی روادار نہیں ہے مگر اسلامی نظام میں زکوٰۃ کے نظام کے بعد کسی اور ٹیکسیشن کی اللہ تعالیٰ کی
سے ممانعت کی کوئی دلیل ہمارے سامنے نہیں ہے اور اسی کے لیے ہم غامدی صاحب سے علمی رہنمائی کے
گار ہیں۔

محترم جاوید احمد غامدی صاحب کو مختلف جہادی گروپوں کی طرف سے جہاد کے نام پر مسلح سرگرمی
اشکال ہے اور وہ ان کے اس عمل کو ''جہاد'' تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کا ارشاد ہے کہ جہاد کا
صرف ایک مسلم حکومت ہی کر سکتی ہے اس کے سوا کسی اور کو جہاد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے مگر ہمیں ان
اس ارشاد سے اتفاق نہیں ہے۔ اس لیے کہ جہاد کی مختلف عملی صورتیں اور درجات ہیں اور ہر ایک کا حکم
الگ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے خلاف جہاد کا اعلان اسی صورت میں ہو سکتا ہے
ایک اسلامی یا کم از کم مسلمان حکومت اس کا اعلان کرے لیکن جب کسی مسلم آبادی پر کفار کی یلغار ہو جا
کفار کے غلبے کی وجہ سے مسلمان حکومت کا وجود ختم ہو جائے یا وہ بالکل بے بس دکھائی دینے لگے تو خاص
حملہ آور قوت کے خلاف جہاد کے اعلان کے لیے پہلے حکومت کا قیام ضروری نہیں ہوگا اور نہ ہی عملاً ایسا
ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسے مرحلے میں مسلمانوں کی اپنی حکومت کا قیام قابل عمل ہو تو کافروں کی یلغار اور قت
بے مقصد ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ صورت پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب مسلمانوں کی حکومت کفار کے غل
تسلط کی وجہ سے ختم ہو جائے، بے بس ہو جائے یا اسی کافر قوت کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ جائے۔

سوال یہ ہے کہ ایسے حالات میں کیا کیا جائے گا؟ اگر جاوید غامدی صاحب محترم کا فلسفہ تسلیم کر لیا جا
یہ ضروری ہوگا کہ مسلمان پہلے اپنی حکومت قائم کریں اور اس کے بعد اس حکومت کے اعلان پر جہاد شرو
جائے لیکن پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوگا کہ جب مسلمانوں نے اپنی حکومت بحال کر لی ہے تو اب جہاد کے اعلا
ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی ہے؟ کیونکہ جہاد کا مقصد تو کافروں کا تسلط ختم کر کے مسلمانوں کا اقتدار بحال
ہے اور جب وہ کام جہاد کے بغیر ہی ہو گیا ہے۔ تو جہاد کے اعلان کا کون سا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ اس کی
عملی مثال سامنے رکھ لیجیے فلسطینی عوام نے ''تنظیم آزادی فلسطین'' کے عنوان سے غیر سرکاری سطح پر اسر

کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ سالہا سال کی مسلح جدوجہد کے نتیجے میں مذاکرات کی نوبت آئی اور ان مذاکرات کے بعد ایک ڈھیلی ڈھالی یا لولی لنگڑی حکومت جناب یاسر عرفات کی سربراہی میں قائم ہوئی جو اس وقت بین الاقوامی فورم پر فلسطینیوں کی نمائندگی کر رہی ہے اگر مسلح جدوجہد نہ ہوتی تو مذاکرات اور حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ مسلح جدوجہد کسی حکومت کے اعلان پر نہیں بلکہ غیر سرکاری فورم کی طرف سے شروع ہوئی اور اسی عنوان سے مذاکرات کی میز بچھنے تک جاری رہی یہاں عملی طور پر ہم دیکھ رہے ہیں حکومت مسلح جدوجہد کے نتیجے میں قائم ہوئی نہ کہ حکومت نے قائم ہونے کے بعد مسلح جدوجہد یا جہاد کا اعلان کیا لیکن اگر غامدی صاحب کے فلسفہ کو قبول کر لیا جائے تو یہ ساری جدوجہد غلط قرار پاتی ہے اور ان کے خیال میں فلسطینیوں کو یہ چاہیے تھا یا شرعاً ان کے لیے جائز راستہ یہ تھا کہ وہ پہلے ایک حکومت قائم کرتے اور وہ حکومت جہاد کا اعلان کرتی پھر ان کی مسلح جدوجہد غامدی صاحب کے نزدیک شرعی جہاد قرار پا سکتی تھی۔

خود ہمارے ہاں برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے بعد مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی نے کٹھ پتلی کی حیثیت اختیار کر لی اور عملاً انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا تو اس وقت کے علما کے سرخیل حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ نے جہاد کا فتویٰ دیا اور پھر بالاکوٹ کے معرکے تک اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں مسلح جہاد کی کوششوں کے مختلف مراحل تاریخ کا حصہ بنے۔ جہاد کا یہ اعلان بھی غیر سرکاری فورم کی طرف سے تھا اور شاہ عبد العزیز دہلوی رحمہ اللہ یا انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے والے دیگر علما کو کوئی سرکاری اتھارٹی حاصل نہیں تھی اس لیے غامدی صاحب کے فلسفے کی رو سے یہ سارا عمل غیر شرعی قرار پاتا ہے اور اگر محترم غامدی صاحب یا ان کا کوئی شاگرد رشید اس دور میں موجود ہوتا تو وہ شاید عبد العزیز دہلوی کو یہی مشورہ دیتا کہ حضور آپ کو جہاد کے اعلان کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی حکومتی معاملات میں فریق بننے کا آپ کے لیے کوئی جواز ہے آپ صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ حکومت کی رہنمائی کریں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آلہ کار کی حیثیت اختیار کر جانے والے مغل بادشاہ کو مشورہ دیتے رہیں اور اس سے کہیں کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف جہاد کا اعلان کریں کیونکہ اس کے سوا جہاد کا اعلان کرنے کا شرعی اختیار اور کسی کے پاس نہیں۔

جہاد افغانستان کی صورت حال بھی کم و بیش اسی طرح کی ہے جب کابل میں روسی فوجیں اتریں، مسلح تصادم کے بعد افغانستان کے معاملات پر روس کا کنٹرول قائم ہو گیا اور ببرک کارمل کی صورت میں ایک کٹھ پتلی حکمران کو کابل میں بٹھا دیا گیا تو افغانستان کے مختلف حصوں میں علماے کرام نے اس تسلط کو مسترد

کرتے ہوئے حملہ آور قوت کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ بعد میں ان کے باہمی روابط قائم ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ چند گروپوں کی صورت میں یکجا ہو گئے پھر انھیں روسی فوجوں کے خلاف مسلح جدوجہد میں ثابت قدم دیکھ کر باہر کی قوتیں متوجہ ہوئیں اور روس کی شکست کی خواہاں قوتوں نے ان مجاہدین کو سپورٹ کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں روس کو افغانستان سے نکلنا پڑا اور سوویت یونین کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ غامدی صاحب کے اس ارشاد کی رو سے یہ سارا عمل غیر شرعی اور ناجائز ٹھیرتا ہے اور ان کے خیال میں افغان علما کو از خود جہاد کا اعلان کرنے کے بجائے ہبرک کارمل کی رہنمائی کرنے تک محدود رہنا چاہیے تھا اور اس سے درخواست کرنی چاہیے تھی چونکہ شرعاً جہاد کے اعلان کا اختیار صرف اس کے پاس ہے اس لیے وہ روسی حملہ آوروں کے خلاف جہاد کا اعلان کرے تاکہ اس کی قیادت میں علماے کرام جہاد میں حصہ لے سکیں۔ فرانسیسی استعمار کے تسلط کے خلاف الجزائر کے علما کو بھی اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا وہاں کے قوم پرست لیڈروں بن باللہ، بومدین اور بوضیاف کے ساتھ الشیخ عبدالحمید بن بادیس اور الشیخ بشیر الابراہیمی جیسے اکابر علما نے بھی مسلح جدوجہد کی قیادت کی۔ انھوں نے فرانسیسی استعمار کے خلاف مسلح جدوجہد کو جہاد قرار دیا، اس کے لیے علما کی باقاعدہ جماعت بنائی اور جمعیۃ علماے الجزائر کے پلیٹ فارم سے سالہا سال تک غاصب حکومت کے خلاف مسلح جنگ لڑ کے الجزائر کی آزادی کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کیا بلکہ الشیخ عبدالحمید بن بادیس کو یہ مشورہ ہی ان کے استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے دیا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مولانا مدنی ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مقیم تھے اور مسجد نبوی میں حدیث نبوی پڑھایا کرتے تھے۔ الشیخ عبدالحمید بن بادیس نے ان سے حدیث پڑھی اور وہیں مدینہ منورہ میں کسی جگہ بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرنے کی اجازت طلب کی تو شیخ مدنی نے ان سے کہا ان کا ملک غلام ہے اس لیے وہ واپس جائیں اور علماے کرام کو منظم کر کے اپنے وطن کی آزادی کے لیے جہاد کریں۔ اگر اس وقت شیخ بن بادیس کے ذہن میں کوئی ''دانش ور'' یہ بات ڈال دیتا کہ آپ لوگوں کو از خود مسلح جدوجہد کے لیے کسی مسلم حکومت کی طرف سے اعلان ضروری ہے تو وہ بھی مدینہ منورہ میں کوئی ''علمی مرکز'' قائم کر کے بیٹھ جاتے اور الجزائر کی جنگ آزادی جو حشر ہوتا وہ ان کی بلا سے ہوتا رہتا۔

غامدی صاحب محترم کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ساتویں صدی ہجری کے آخر میں عالم اسلام خلاف تاتاریوں کی خوف ناک یلغار کے موقع پر جب دمشق کے حکمران سراسیمگی اور تذبذب کے عالم میں

عوام تاتاریوں کے خوف سے شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے تو اس موقع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے از خود جہاد کا اعلان کر کے عوام کو اس کے لیے منظم کرنا شروع کر دیا تھا جس کے نتیجے میں حکمرانوں کو حوصلہ ہوا نے شہر چھوڑنا ترک کیا ورنہ اگر ابن تیمیہ بھی غامدی صاحب کے فلسفہ پر عمل کرتے تو بغداد کی طرح کی بھی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔

محترم جاوید احمد غامدی نے مولوی کے فتوئی کے خلاف بنگلہ دیش کی کسی عدالت کے فیصلے پر مسرت کا اظہار ہے اور اسے صدی کا بہترین عدالتی فیصلہ قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ فتووں کا بعض اوقات انتہائی غلط کیا جاتا ہے اس لیے فتوئی بازی کو اسلام کی روشنی میں ریاستی قوانین کے تابع بنانا چاہیے۔

بنگلہ دیش کی کون سی عدالت نے مولوی حضرات کے کون سے فتوے کے خلاف کیا فیصلہ دیا ہے؟ ہمیں اس کا علم ہے اور نہ ہی مذکورہ فیصلہ ہماری نظر سے گزرا ہے لیکن غامدی صاحب کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ عدالت نے بھی مولوی صاحب کو فتوئی دینے سے روک دیا ہوگا یا ان کے فتوئی دینے کے استحقاق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہوگا جس کی بنا پر غامدی صاحب اس کی تحسین فرما رہے ہیں اور پاکستان کے لیے بھی یہ چاہتے ہیں کہ مولویوں کو فتوئی دینے کی آزادی نہیں ہونی چاہیے اور فتوئی بازی کو ریاستی قوانین کے تابع کر دینا چاہیے۔

جہاں تک اس شکایت کا تعلق ہے کہ ہمارے ہاں بعض فتووں کا انتہائی غلط استعمال ہوتا ہے ہمیں اس سے انکار نہیں ہے۔ ان فتووں کے نتیجے میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں وہ بھی ہمارے سامنے ہیں اور ان خرابیوں کی روک تھام کے لیے غیر سرکاری سطح پر کوئی قابل عمل فارمولا سامنے آتا ہے تو ہمیں اس سے بھی اختلاف نہیں ہوگا لیکن فتوے کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے سرے سے اس کے وجود کو ختم کر دینے کی تجویز ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اور یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ چونکہ ہماری عدالتوں میں رشوت اور سفارش اس قدر عام ہو گئی ہے کہ غلط فیصلے ہونے لگے ہیں اور عدالتی نظام پر عوام کا اعتماد ختم ہوتا جا رہا ہے اس لیے ان عدالتوں میں بیٹھنے والے ججوں سے فیصلے دینے کا اختیار ہی واپس لے لیا جائے۔ یہ بات فطری طور پر کسی بحث و مباحثہ کا خوب صورت عنوان تو بن سکتی ہے مگر عملی میدان میں اسے بروئے کار لانا کس طرح ممکن ہے؟ اس کے بارے میں غامدی صاحب ہی زیادہ بہتر طور پر رہنمائی فرما سکتے ہیں۔

فتوئی تو کہتے ہی کسی مسئلہ پر غیر سرکاری رائے کو ہیں کیونکہ کسی مسئلہ پر حکومتی انتظامیہ کا کوئی افسر جو

فیصلہ دے گا وہ ''حکم'' کہلائے گا اور ''عدالت'' فیصلہ صادر کرے گی تو اسے ''قضا'' کہا جائے گا اور ان دونوں سے ہٹ کر اگر کوئی صاحب علم کسی مسئلے کے بارے میں شرعی طور پر حتمی رائے دے گا تو وہ فتویٰ کہلائے گا۔ امت کا تعامل شروع سے اسی پر چلا آ رہا ہے کہ حکام حکم دیتے ہیں قاضی حضرات عدالتی فیصلے دیتے ہیں اور علمائے کرام فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ صحابہ کرام کے دور سے چلا آ رہا ہے خود صحابہ کرام میں خلافت راشدہ کے دور میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہ جیسے مفتیانِ کرام موجود تھے جو کسی مسئلہ پر فتویٰ صادر کرنے میں کسی سرکاری نظم کے پابند نہیں تھے بلکہ آزادانہ طور پر مسائل پر رائے دیتے تھے اور ان کی رائے کو تسلیم کیا جاتا تھا اور تابعین کے دور سے تو فتویٰ کا یہ ادارہ اس قدر آزاد اور خود مختار ہوا کہ بڑے بڑے مفتیانِ کرام وقت کی حکومتوں کے خلاف فتوے دیتے تھے اور ان فتووں پر مصائب و آلام بھی برداشت کرتے تھے مگر انھوں نے اپنے اس آزادانہ حق میں حکومتوں کی کسی مداخلت کو قبول نہیں کیا۔

طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق رئیس التابعین حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے خلیفہ یزید بن عبدالمالک کے طرز عمل پر برسر عام تنقید کرتے ہوئے لوگوں سے کہا کہ وہ اس کے مظالم میں اس کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ کامل ابن اثیر رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق حضرت امام مالک نے خلیفہ منصور کے خلاف محمد نفس زکیہ رحمہ اللہ کی حمایت کرتے ہوئے لوگوں سے کہا کہ وہ منصور کی بیعت توڑ کر محمد نفس زکیہ کا ساتھ دیں۔

ہزاری کی مناقب ابی حنیفہ رحمہ اللہ میں ہے کہ امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ نے محمد نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کی مذکورہ بغاوت کی کھلم کھلا حمایت کی اور خلیفہ منصور رحمہ اللہ کے کمانڈر حسن بن قحطبہ نے امام ابوحنیفہ کے کہنے پر ابراہیم بن عبداللہ کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا اس سے قبل اموی خلیفہ ہشام بن عبدالمالک رحمہ اللہ کے دور میں اس کے خلاف امام زید بن علی کی بغاوت میں بھی امام ابوحنیفہ نے امام زید کا ساتھ دیا اور انھیں دس ہزار درہم کا چندہ بھی بھجوایا خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں حضرت امام شافعی کو بھی اس الزام میں گرفتار کیا گیا کہ وہ خلیفہ وقت کے خلاف یحییٰ بن عبداللہ کی بغاوت کی در پردہ حمایت کر رہے تھے مگر الزام ثابت نہ ہونے پر بعد میں رہا کر دیا گیا امام مالک نے ''جبری طلاق'' کے بارے میں حکومتِ وقت کی منشا و مفاد کے خلاف فتویٰ دیا جس پر سرِ عام ان پر کوڑے برسائے گئے حتیٰ کہ ان کے شانے اتر گئے مگر وہ اسی شان سے اپنے فتوے پر قائم رہے کہ جب انھیں گھوڑے پر سوار کر کے بازار میں پھرایا جا رہا تھا تو وہ لوگوں سے

بلند آواز میں کہتے جاتے تھے جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ تو جانتے ہی ہیں اور جو نہیں جانتے وہ جان لیں کہ میں مالک بن انس ہوں اور میں نے فتویٰ دیا ہے کہ جبر کی حالت میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ حکمرانوں کو امام مالک کے اس فتویٰ سے خوف لاحق ہو گیا تھا کہ اگر مجبوری کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی تو جن لوگوں کو مجبور کر کے انھوں نے اپنے حق میں بیعت لے رکھی تھی کہیں وہ یہ نہ سمجھنے لگ جائیں کہ ہماری بیعت بھی واقع نہیں ہوئی اور ہم اس بیعت کے ساتھ حکمرانوں کی وفاداری کے پابند نہیں رہے۔

حکمرانوں کی مرضی اور منشا کے خلاف دیے جانے والے ان ''فتووں'' سے قطع نظر امت مسلمہ کے چار بڑے اماموں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے جو لاکھوں فتاوی صادر کیے ہیں، وہ کسی سرکاری نظم اور ریاستی قوانین کا نتیجہ نہیں بلکہ شرعی مسائل پر اہل علم کی طرف سے اظہار رائے کے ایک آزادانہ نظام کا ثمرہ ہے ورنہ اگر یہ ائمہ کرام فتویٰ صادر کرنے میں سرکاری نظم اور ریاستی قوانین کے تابع ہونے کو قبول کر لیتے تو نہ امام ابوحنیفہ کا جنازہ جیل سے نکلتا، نہ امام مالک سر عام کوڑے کھاتے، نہ امام شافعی کی گرفتاری کی نوبت آتی اور نہ امام احمد بن حنبل کو خلق قرآن کے مسئلے پر قید و بند اور کوڑوں کی صبر آزما سزا کے مراحل سے گزرنا پڑتا۔ ان چاروں اماموں اور ان کے علاوہ دیگر بیسیوں فقہا اور ائمہ نے جو لاکھوں فتوے دیے اور امت کے بے شمار مسائل کا جو مفتی حل پیش کیا وہ ایک آزادانہ عمل تھا اور اسی وجہ سے انھیں امت میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج تیرہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی امت کی غالب اکثریت ان ائمہ کے فتاوی پر عمل کرتی ہے اور ان کے فقہی مذاہب کی پیروکار ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ نے تو اپنی ایک مستقل مجلس علمی قائم کر رکھی تھی جس میں علما، فقہا، محدثین، اہل لغت اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا جمگھٹا رہتا تھا۔ یہ غیر سرکاری کونسل تھی جو مسائل پر بحث کرتی تھی اس کے شرکا آزادانہ رائے دیتے تھے ان کے درمیان مباحثہ ہوتا تھا جو بات طے ہوتی اسے فیصلے کے طور پر قلم بند کیا جاتا تھا اور اس کونسل کے فیصلے نہ صرف اس دور میں تسلیم کیے جاتے تھے بلکہ اب تک امت کا ایک بہت بڑا حصہ ان فیصلوں پر کاربند ہے۔ امام صاحب کی اس مجلس علمی غیر سرکاری کونسل کے بارے میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ علوم عربی و اسلامیات کے سربراہ ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی کی مستقل کتاب ہے جس میں انھوں نے اس کونسل کے خدوخال اور طریق کار کی وضاحت کی ہے اس لیے فتویٰ کے آزادانہ عمل کو ریاستی قوانین کے تابع کرنے کی یہ تجویز خواہش امت کے چودہ سو سالہ اجتماعی تعامل کے منافی ہے جس کی کسی صورت میں حمایت نہیں کی جا سکتی

اور ہمارے محترم اور بزرگ دوست جاوید احمد غامدی صاحب ناراض نہ ہوں تو ڈرتے ڈرتے ان سے سوال پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ انھوں نے مختلف گروپوں کی مسلح جدوجہد کے جہاد نہ ہونے، زکوٰۃ کے علاوہ کی ممانعت اور ریاستی نظم سے ہٹ کر فتویٰ کا استحقاق نہ ہونے کے بارے جو ارشادات فرمائے ہیں وہ معروف معنوں میں فتویٰ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں انھیں یہ فتویٰ جاری کرنے کی اتھارٹی کس ریاستی قانون نے دی ہے؟

لاہور (نمائندہ نوائے وقت) اسلام اور دیگر مشرقی علوم کے معروف امریکی اسکالر پروفیسر جان وال برج نے کہا ہے کہ اسلام اتحاد اور قانون کا مذہب ہے۔ اسلامی معاشرہ میں ''درس نظامی'' کا روایتی نظام ختم ہونے سے اسلامی تعلیمات کو نقصان اور اسلام میں اختلافات کے خاتمے کے ماحول کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے۔ انہوں نے ان خیالات کا اظہار گزشتہ روز اقبال میموریل لیکچر ۲۰۰۱ء سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا جس کا اہتمام شعبہ فلاسفی جامعہ پنجاب نے ''یوم اقبال'' کے حوالے سے کیا تھا۔ لیکچر کی صدارت جامعہ کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر رفیق احمد نے کی۔ پروفیسر جان وال برج نے مزید کہا کہ نوآبادیاتی نظام جدیدیت اور سیکولرازم کے نظاموں نے اسلامی تعلیمات کے پرانے نظام ''درس نظامی'' کو ختم کر دیا ہے جس سے اسلامی تعلیمات وعلوم اور اسلامی قانون کی تحقیق کے حوالے سے حوصلہ شکنی ہوئی ہے جبکہ اسلامی معاشروں کو درس نظامی کے پرانے اور فعال نظام کی ضرورت ہے۔ اسی نظام سے اسلامی معاشروں میں اختلافات کے خاتمے میں مدد ملتی تھی اور معاشرے میں برداشت عام ہوتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ جدیدیت پسند اور بنیاد پرست دونوں مسلمان گروپ درس نظامی کے فعال کردار کے خاتمے پر خاموش ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر اسلام کی تشریح اپنے حوالے سے کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ درس نظامی کی تھوڑی سی روایت اس وقت صرف مصر، ایران اور عراق میں ہے۔ باقی مسلم دنیا سے یہ روایت ختم ہوگئی ہے۔ حتیٰ کہ مصر میں بنیاد پرست اور لبرل مسلمان دونوں ''الازہر'' کی روایت کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ انڈونیشیا جیسے اسلامی ملک کے سرکاری اسلامی مدرسوں میں اجتہاد کے نام حکومتی پالیسیوں کو درست قرار دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کی اکثریت اسلام کو مکمل ضابطہ حیات تسلیم کرتی ہے۔ ان کے نزدیک معاشرے میں سیاست، معیشت اور سماج کو اسلام سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام نے اسلامی معاشروں کے قیام پر براہ راست اثر ڈالا ہے لہٰذا یہ قدرتی امر ہے کہ مسلمان اپنے تمام مسائل کا حل اسلام میں تلاش کریں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں درس نظامی سے دوری دکھائی دیتی ہے۔ سکولوں میں پڑھائی جانے والی اسلامیات میں درس کی روایت کا ذکر تک نہیں۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۲۲ اپریل ۲۰۰۱ء)